مولانا ظہار الحق حقانی

غلام احمد پرویز کا تصورِ الٰہ!

ایک تنقیدی جائزہ

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے مختلف شعبوں کے لئے مختلف رجال کار پیدا کئے ہیں اور وہ اپنی سمجھ اور بصیرت کے مطابق اپنے اپنے میدان کار میں سرگرم عمل ہیں۔ دینیات کا شعبہ بھی انہی شعبوں میں سے ایک ہے اور دنیا کی آبادی کا ایک قابل ذکر حصہ کسی نہ کسی شکل میں دین سے وابستگی پر بجا طور پر نازاں ہے۔ یہی لوگ تبلیغ، تحقیق، تدریس اور تقریر و تحریر کے علاوہ بہت سارے دیگر میدانوں میں خدمات سرانجام دیتے ہیں۔

اسلام نے اپنے آپ کو دین (System of Life) کے طور پر پیش کیا ہے، ہمارے دین نے ایمانیات کے ساتھ ساتھ عبادات، اخلاقیات اور معاملات کی اصلاح کی تاکید کی ہے اور اس سلسلے میں راہنما اصول اسلام کے دو بنیادی ماخذ (Sources) قرآن و سنت میں محفوظ ہیں پھر صحابہ کرامؓ تابعین اور علماء مجتہدین نے ان اصولوں کی روشنی میں اجماع، قیاس اور اجتہاد کے ذریعے قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے نو پیدا شدہ مسائل حل کرنے کی کوشش کی اور دیگر اصول بھی وضع کئے، تعبیر و تشریح اور مذکورہ مصادر (sources) میں موجود بنیادی اصول کے تناظر میں اہل علم نے مختلف انداز میں ایسا قابل قدر کام کیا ہے جس پر آج تک قانون سازی کی تاریخ فخر کرتی ہے۔

تاریخ اسلام اس بات پر شاہد ہے کہ زمانہ خاتم النبیینؐ سے لے کر آج تک امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ قرآن و سنت اسلامی قانون کے بنیادی ماخذ ہیں۔ قرآن نے ہمیں جس طرح حجیت سنت کی نشاندہی کی ہے بالکل اسی طرح اجماع و قیاس بھی ان دو ماخذ سے تصدیق شدہ ہیں۔ اگر کوئی بات ان ماخذ سے تصدیق شدہ ہو۔ تو اس کو ہم ایمانیات کے زمرے میں شامل کر لیتے ہیں مثلاً توحید، رسالت، قیامت وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جن کے بارے میں تمام افراد امت کا ایک اجماعی عقیدہ رہا ہے۔ فروعی مسائل میں اختلاف کی گنجائش تو ہر وقت رہتی ہے تاہم ایمانیات کی حیثیت اس سے بالکل مختلف ہے۔ الٰہ (خدا) کا ایک خاص تصور مسلمانوں کا ہے۔ اور اس پر ہزار ہا برس سے مسلمان کاربند ہوتے آئے ہیں۔ اس تصور کی بنیاد میں قرآن و سنت کے بالکل واضح ارشادات موجود ہیں مگر مختلف زمانوں میں ایسے لوگوں کے نام بھی تاریخ کے اوراق میں محفوظ ہیں

جنہوں نے عالم اسلام کے اندر رہتے ہوئے بحیثیت مسلمان (نام نہاد) اور دانشور ایسی تعبیرات و تشریحات کی جسارت کی ہے جس سے درحقیقت مسلمانوں کے ان اجماعی عقائد کی دیوار میں دراڑیں پیدا کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ تاثر دیا جانے لگا کہ آج تک قرآن کی جتنی بھی تعبیرات ہوئی ہیں وہ درست اور قابل عمل نہیں ہیں۔ اس قسم کے دانشوروں میں سے ایک نام چوہدری غلام احمد پرویز کا بھی ہے۔

غلام احمد پرویز کی ولادت ۹ جولائی ۱۹۰۳ء کو ضلع گورداسپور کے قصبہ بٹالہ (موجودہ ہندوستان) میں ہوئی اور مورخہ ۲۴ فروری ۱۹۸۵ کو لاہور میں وفات پائی۔ ۱۹۲۱ء میں اے لیڈی آف انگلینڈ ہائی سکول بٹالہ سے میٹرک پاس کیا اور بی۔ اے پاس کرنے کے بعد سول سروس میں چلے گئے۔ ۱۹۵۴ء میں جبکہ پرویز وزارت داخلہ میں اسسٹنٹ سیکرٹری کے طور پر کام کر رہے تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ اور اپنے ایک خاص انداز میں قرآن کی من مانی تعبیر و تفسیر کا کام کرنے لگے اس سلسلے میں مفہوم القرآن 'لغات القرآن' جہانِ فردا' شاہکار رسالت 'اسلام کیا ہے ؟' مقام حدیث 'برقِ طور 'شعلہ مستور 'انسان نے کیا سوچا ؟ قرآن کا نظام ربوبیت معراج انسانیت 'ابلیس و آدم 'کتاب التقدیر' سلیم کے نام خطوط اور قرآنی فیصلے ان کی شاہکار تصانیف سمجھی جاتی ہیں

اس سے قبل کہ غلام احمد پرویز کے تصور الٰہ (خدا) پر باقاعدہ کچھ عرض کیا جائے۔ ایک بات واضح کرتا چلوں کہ جب سے ان کے افکا وخیالات اور تحریرات رسالہ طلوع اسلام اور کتب کی شکل میں سامنے آنا شروع ہوئے تو علمائے کرام اور مشائخ عظام نے ان کا "تعاقب" شروع کیا ہے۔ اور پہلے دن ہی سے انکے افکار و نظریات اور تعبیرات پر تنقید کی ہے۔ مگر پرویز صاحب نے ان لوگوں سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنا کام جاری رکھا۔ بالآخر ۱۹۶۲ء میں تقریباً ہر مکتبہ فکر کے ایک ہزار علماء کرام نے انکے خلاف کفر کا فتویٰ جاری کر دیا۔ ابھی حال ہی میں وزارت الاوقاف کویت نے سرکاری سطح پر غلام احمد پرویز کو مرتد قرار دیا۔ امام الحرمین شریفین محمد عبداللہ السبیل اور مفتی اعظم سعودی عرب الشیخ عبدالعزیز بن عبداللہ نے بھی فروری ۲۰۰۰ء میں اس قسم کے فتو۔ جاری کئے اس سے قبل مرحوم مفتی اعظم سعودی عرب الشیخ عبدالعزیز بن باز نے بھی غلام احمد پرویز کو منکر سنت کی حیثیت سے خارج از اسلام قرار دیا تھا۔ متحدہ عرب امارات دبئی کے اسلامک مشن نے بھی انکے مرتد ہونے کا فتویٰ صادر کیا ہے۔

قارئین یقیناً سوچتے ہونگے کہ ہزارہا علماء کے فتاویٰ و تحقیق کے بعد مجھ جیسا کم فہم اس سلسلے میں ان کو کیا اضافی نقطہ دینا چاہتا ہے۔ سو عرض یہ ہے کہ علمائے کرام نے پرویز کے لٹریچر پر مختلف پہلوؤں سے جو مواد پیش کیا ہے (ان میں مولانا یوسف لدھیانویؒ کا نام نامی بھی شامل ہے۔ جنہیں گزشتہ دنوں شہید کیا گیا) وہ ہر لحاظ

سے جامع اور درست ہے مگر بعض قارئین خصوصاً کالج اور یونیورسٹی کے طلباء چونکہ عدیم الفرصت ہوتے ہیں اور وہ من وعن تمام حوالہ جات اور لٹریچر پر تنقیدی اور تحقیقی کام کا مطالعہ کرنے سے قاصر ہوتے ہیں ساتھ ہی وہ یہ بھی چاہتے ہیں کہ کوئی ایسا مواد ان کے ہاتھ آئے جو مختصر ہو پرویز کے افکار و نظریات اور تعبیرات کا اس میں صرف ایک خاص پہلو Discuss کیا گیا ہو۔ اور حیثیت مسلمان اس مواد کا مطالعہ کرنے سے ایسا علمی اسلحہ ان کے ہاتھ آئے۔ کہ اس کے ہوتے ہوئے لغزش قدم کا اندیشہ نہ رہے لہذا میں کالج اور یونیورسٹی کے طلباء کو مد نظر رکھ کر یہ مضمون تحریر کر رہا ہوں۔

میں عرصہ دراز تک پرویز کے لٹریچر کا قاری رہا ہوں۔ اس بعض کتابیں تو دو دو تین تین بار بھی زیر مطالعہ رہیں۔ اس لٹریچر کے خلاف جو کچھ لکھا جا چکا ہے اسکا مطالعہ کرنے کی بھی توفیق نصیب ہوئی ہے میری رائے یہ ہے کہ پرویز صاحب کا جو تصور الٰہ ہے۔ وہ قرآن وسنت کی تعلیمات سے یکسر متصادم ہے اور ہماری سماجی' اور معاشرتی اقدار سے بھی مطابقت نہیں رکھتا۔ آیئے دیکھتے ہیں پرویز کا تصور الٰہ کیا ہے؟ مجھے امید ہے کہ اس موضوع پر یہ تحریر مطالعہ کرنے کے بعد تمام قارئین بھی ان شاء اللہ پرویز کے بارے میں خود کوئی فیصلہ کرنے کے اہل ہو جائیں گے۔ پرویز کا جو تصور الٰہ ہے۔ وہ انکی کتاب "کتاب التقدیر" کا مطالعہ کرنے سے واضح طور پر سامنے آجاتا ہے۔ کتاب التقدیر میں انہوں نے اپنے ایک خاص انداز میں مسئلہ تقدیر پر بحث کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اگر پرویز کے جملہ افکار سے اتفاق کیا جائے تو پھر یہ مسئلہ بظاہر لاینحل نہیں رہتا۔ مگر اس میں جو بنیادی نقصان ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی صفات مثلاً قادر' قدیر' سمیع الدعاء قادر مطلق وغیرہ سے ہاتھ دھونا پڑے گا۔

"کتاب التقدیر" کے دوسرے باب کا عنوان ہے "خدا کا تصور" جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک عالم خلق ہے اور ایک عالم امر۔ عالم امر خدا کی تخلیق کردہ کائنات سے ماوراء ہے اور عالم خلق خدا کی پیدا کردہ کائنات پر مشتمل ہے۔ قانون کا تعلق عالم خلق سے ہے عالم امر سے نہیں لکھتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کائنات میں نہ کوئی معلول (Effect) بغیر علت (Cause) کے وجود میں آسکتا ہے۔ اور نہ کوئی شے کسی پہلے سے موجود مادہ (Mate-rial) کے بغیر وجود پذیر ہو سکتا ہے یہ خدا کا قانون ہے لیکن اسکا تعلق عالم خلق سے ہے۔ عالم امر سے نہیں۔ (کتاب التقدیر ص ۳۵)

یوں گویا ان اللہ یفعل ما یرید۔ یقیناً اللہ اپنے اختیار وارادہ کے مطابق جیسا چاہتا ہے کر لیتا ہے ان ربك فعال لما یرید۔ یقیناً تیرا رب جیسا چاہے کر لیتا ہے ان اللہ یحکم مایرید۔ یقیناً اللہ اپنے ارادے کے مطابق جو چاہتا ہے کرتا ہے لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون۔ اس سے یہ نہیں پوچھا جا سکتا کہ تم نے ایسا

کیوں کیا ہے اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔ واذا قضیٰ امراً فانما یقول له کن فیکون اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کے لئے فقط اتنا کہہ دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے وغیرہ آیات کا تعلق خدا کی پہلی دنیا (عالم امر) سے ہے موجودہ انسانی دنیا سے نہیں۔ لکھتے ہیں :

"یہ ہے خدا کا عالم امر یحکم مایرید اور یفعل ما یشاء کا عالم" ص ۳۷

پرویز صاحب نے بڑی مہارت سے ان تمام اصطلاحات الفاظ و آیات قرآنی کے جدید اور من پسند معانی مفہوم متعین کئے ہیں جہاں اللہ کی قدرت وغیرہ صفات کا عالم خلق میں اثبات کا ان کو شبہ ہوا ہے۔ آگے جانے سے قبل یوں کہا جا سکتا ہے کہ پرویز کا تصور خدا یہ ہے کہ خدا نے کسی زمانے میں تخلیق' قانون سازی وغیرہ کی ہے اور اس کے بعد جب سے کائنات وجود میں آئی ہے۔ خدا (نعوذ باللہ) ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر فارغ بیٹھے ہوں یوں پھر قرآن کریم کی آیت کل یوم ھو فی شان بھی بقول انکے عبوری دور کے لئے ہوگی۔ ملاحظہ کیجئے انکی کتاب "کتاب التقدیر" سے چند اقتباسات۔

(۱) "ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ عالم خلق میں آکر خدا کا امر "قدر مقدور" ہو جاتا ہے یعنی وہ مقرر کردہ پیمانوں کے قالب میں ڈھل جاتا ہے" ص ۴۴

(۲) "جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اسے سمٹا کر بیان کیا جائے تو حسب ذیل نتائج سامنے آئیں گے۔ ان اللہ علی کل شئی قدیر۔ خدا نے ہر شے کے لئے قوانین مقرر کر رکھے ہیں اور انہی قوانین کی رو سے وہ ان پر پورا پورا کنٹرول رکھتا ہے" ص ۴۶

(۳) "ہم نے دیکھ لیا کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کی اس نئی منزل میں ایک عظیم انقلاب رونما ہوا ہے اور وہ یہ کہ خدا کا امر (جو کسی قاعدے اور ضابطے کا پابند نہیں تھا امر مقدور ہو گیا یعنی وہ مطلق اختیار کے بجائے قانون بن گیا۔ اور قانون بھی ایسا جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ بالفاظ دیگر اس مرحلہ میں خدا نے اپنے اوپر پابندیاں عائد کر لیں۔ خدا کے لئے پابندی کے تصور سے احساس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے لیکن جب اس نے خود ہی ایسا کیا اور کہا تو ہمارے لئے اس کو تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے" ص ۴۶

(۴) "ان تصریحات کی روشنی میں دو بنیادی امور ہمارے سامنے آجاتے ہیں۔

(الف) یہ جو ہم ہر ناگہانی مصیبت اور ناخوشگوار واقعہ پر کہتے ہیں کہ کیا کیا جائے اللہ کی مرضی ہی ایسی تھی۔ یا اللہ کو بھی منظور تھا۔ تو ایسا کہنا نہ صرف حقیقت کے خلاف ہے بلکہ خود اللہ تعالیٰ کے خلاف بہت بڑا الزام ہے خدا کی مرضی ہی ایسی تھی کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جو کچھ ہوا ہے نہ اسکے ہم ذمہ دار ہیں۔ ہم نے تو ہر طرح کی کوشش

کرلی تھی۔ کہ ایسا نہ ہو لیکن اس کے باوجود خدا نے ایسا کر دیا اور نہ ہی کوئی معقول وجہ ہماری سمجھ میں آتی ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ خدا کی مرضی کے خلاف دم مارنے کی جانہیں وہ قادر مطلق ہے وہ جو جی چاہے کرلے.....

(ب) اور دوسری بات یہ کہ انسان کی تجویز و تدبیر اور اس کی تگ و تاز اور سعی و کاوش سے کچھ نہیں ہوتا وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے۔ اس سے انسان ایک مجبور مخلوق بن کر رہ جاتا ہے۔ ص ۸۶۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ جہاں خدا سے متعلق شاء یشاء جیسے الفاظ آئیں ان کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ انکا ترجمہ یوں ہونا چاہیے کہ سب کچھ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہوتا ہے۔ ص ۱۹۷

(۵) "ہمارے ہاں جو ماشاء اللہ کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے جو اللہ چاہے گا اور اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ ہم جو جی میں آئے کرلیں ہوگا وہی جو خدا چاہے گا۔ جو خدا کو منظور ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم تقدیر کے اس تصور سے پیدا ہوتا ہے جس کی رو سے انسان کو مجبور قرار دیا جاتا ہے۔ چونکہ تقدیر کا یہ تصور خلاف قرآن ہے اسلئے ماشاء اللہ کا مذکورہ صدر مفہوم بھی صحیح نہیں اسکا صحیح مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہو رہا ہے۔ ص ۲۰۴

(۶) حاصل کلام یہ کہ ماشاء اللہ کے معنی یہ نہیں کہ جیسا خدا چاہے گا ویسا ہی ہوگا اس لئے کہ انسان کے لئے تو خود خدا نے کہہ دیا ہے کہ اعملو اما شئتم جس طرح تمہارا جی چاہے کرو۔ خدا کی مشیت قانون مقرر کرنے تک تھی۔ جب اس نے غیر متبدل قوانین بنا دیئے تو اس کے بعد انسان کی مشیت کارفرما ہوگی۔ یعنی اس کا جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق کام کرے جی چاہے تو ان کے خلاف روش اختیار کرلے البتہ یہ بات ذہن میں رہے کہ انہ بما تعملون بصیر۔ ص ۲۰۷

(۷) "جب سے مسلمانوں نے قرآن کو چھوڑا تو انکے ہاں بھی خدا کا تصور ایک مطلق العنان ڈکٹیٹر کا سا پیدا ہو گیا کہ جس کے ہاں نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ وہ جو جی میں آئے کرتا رہے اور اس سے کوئی پوچھ نہیں سکتا کہ اس نے ایسا کیوں کیا ہے؟ اصل یہ ہے کہ جب تک امت میں قانون کی حکمرانی رہی اسے خلافت راشدہ کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک خدا کے متعلق قرآنی تصور قائم رہا لیکن جب اسکے بعد خلافت بادشاہت میں تبدیل ہوگئی تو خدا کے متعلق بھی تصور بدل گیا..... لیکن درحقیقت ہم نے خدا کو زمین کے بادشاہوں کے قالب میں ڈھال رکھا ہے..... جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کردے جسے چاہے جاگیریں بخش دے جس سے چاہے چھین لے ..... قرآن کا خدا انسانوں کے ان خود ساختہ تصورات سے بہت بلند ہے۔ ص ۲۲۷

(۸) "یہ نکتہ بھی قابل غور ہے کہ قرآن کریم میں کئی جگہ ان اللہ علی کل شئی قدیر آیا ہے یعنی ان آیات میں اشیاء کہا گیا ہے۔ انسان نہیں کہا اس سے یہ مفہوم بھی لیا جاسکتا ہے کہ اشیائے کائنات تو خدا کے پیمانوں (قوانین) کے مطابق چلنے کیلئے مجبور ہیں لیکن انسان مجبور نہیں۔ ص ۲۳۴

آپ یقیناً سمجھ گئے ہونگے کہ پرویز صاحب کا اصل تصور الٰہ کیا ہے۔ رزق، عزت اور ذلت دینے اور دیگر امور کے بارے میں انکا یہی موقف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان سب امور کے لئے قوانین مقرر کئے ہیں۔ جنہیں پرویز صاحب قانون مشیت کہتے ہیں اور ان قوانین پر اللہ تعالیٰ خود ہر حال میں کاربند رہنے کا پابند ہے۔ گویا عالم امر کے بعد اب قانون مشیت خود خدا بن گیا ہے آیئے دیکھئے۔ درج ذیل آیت کا وہ کسی طرح ترجمہ بامفہوم بیان کرتے ہیں۔

قل اللھم ملك الملك توتی الملك من تشاء و تنزع الملك فمن تشاء وتغر من تشاء و تذل من تشاء بیدك الخیر انك علی كل شئی قدیر۔ ۳/۲۵

بار الہا! قوت واقتدار کا حقیقی مالک تو ہے جو لوگ تیرے قانون مشیت کے مطابق چلے ہیں تو انہیں اقتدار عطا کر دیتا ہے۔ جو اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ ان سے اقتدار چھین لیتا ہے عزت وذلت تیرے قانون مشیت کے مطابق ملتی اور چھنتی ہے۔ یہ سب کچھ یونہی دھاندلی سے نہیں ہوتا۔ دھاندلی سے کیسے ہو سکتا ہے تو نے ہر بات کے لئے پیمانے 'اندازے' قوانین مقرر کر رکھے ہیں جو فیصلہ قانون حقہ کے مطابق ہو اس میں ظلم اور زیادتی کا شائبہ تک نہیں رہتا۔ ص ۳۱۳

اس مفہوم سے ہم بآسانی یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ملک یا دنیا میں جتنے بھی حکمران برسر اقتدار آئے ہیں۔ وہ قانون مشیت خداوندی کو Follow کرتے رہے ہیں چند صفحات آگے جاکر پرویز صاحب نے فیغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء کا وہی مفہوم بیان کیا ہے۔ اور پھر اس پر تبصرہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

"اس عقیدہ نے کہ نجات اور مغفرت انسان کے اپنے اعمال سے نہیں ہوتی۔ یہ خدا کے فضل اور اسکی رحمت پر موقوف ہے وہ جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے اس قوم کو تباہیوں کے کن عمیق غاروں میں دھکیل دیا ہے۔ اسکا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔" ص ۳۲۹

میں نے ابتداً عرض کیا تھا کہ پرویز صاحب کا تصور خدا ہماری معاشرتی اور سماجی اقدار سے پہلے بھی ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس کے تصورات وافکار قبول کرنے سے ہماری سماجی و مذہبی اقدار کی عمارت دھڑام سے گر جائے گی۔ زیر بحث انکی کتاب کے ۱۶ ابواب کے چیدہ چیدہ اقتباسات آپ نے پڑھے۔ ان ابواب میں پرویز

صاحب یہی پیغام دینا چاہتے ہیں کہ پہلے خدا تھا اب اسکی بجائے قانون مشیت کار فرما ہے آپ ہزار بار دعائیں مانگتے جائیں۔ وہی ہو گا جو قانون مشیت کا تقاضا ہے جبکہ ہمارے معاشرے میں ایک دوسرے کیلئے نیک تمنائیں و دعائیں بڑی کار آمد نظر آتی ہیں۔ یہی کچھ ہمیں قرآن نے بتایا ہے اور یہی کچھ بے شمار احادیث میں موجود ہے قرآن کریم میں انفرادی اور اجتماعی دعاؤں کا تذکرہ جابجا موجود ہے نیک خواہشات اور دعاؤں سے آپس کے روابط اور تعلقات بھی بڑھتے ہیں اور دلوں کو سکون ملتا ہے۔

پرویز صاحب نے جب خدا کا تصور ہی تبدیل کر دیا جب خدا نعوذ باللہ ایک بے اختیار ہستی ہے تو اس کے سامنے دست دعا دراز کرنا ہی بے سود ہے "کتاب التقدیر" کا ستر ہواں باب ہی دعا کے موضوع پر ہے آیئے دیکھتے ہیں پرویز صاحب نے کس مہارت سے ہمارے ہاتھ سے یہی ایک سہارا (دعا) (جس کو عبادت کا مغز کہا گیا ہے اور جس کے بارے میں قرآن نے فرمایا۔ اجیب دعوۃ الداع اذا دعان یعنی میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کر لیتا ہوں جب وہ مجھ سے مانگتا ہے) بھی چھین لیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ پرویز صاحب اس اجماعی عقیدے تصور خدا اور دعا کو بیک جنبش قلم ہمارے ہاتھ سے لے کر آخر ہماری کیا خدمت کرنا چاہتے ہیں؟

یہ حقیقت ہے اور پرویز صاحب نے بھی بعض مقامات پر اسکا اعتراف کیا ہے کہ دنیا کی تاریخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ انسان نے ہر زمانے اور ہر دور میں ان دیکھی قوت یا قوتوں سے دعائیں مانگی ہیں۔ قوموں کی زندگی میں ہزار اختلاف ہوا نکے طرز زندگی اور انداز معاش و معاشرت میں لاکھ تفاوت ہو۔ ان میں کوئی بھی قدر مشترک نہ ہو۔ اس کے باوجود ان میں ایک چیز قدر مشترک کے طور پر ضرور پائی جائے۔ اور وہ ہو گی کسی مافوق الفطرت سے دعائیں مانگنا اور اپنی مدد کے لئے التجا کرنا۔ دعا ہی ہر بے سہارا کا سہارا۔ ہر بے آسرا کا آسرا اور ہر ضعیف و ناتواں کا سامان تقویت ہے۔

پرویز صاحب نے دعا کے موضوع پر تفصیلی بات کی ہے آخر میں ایک سوال اٹھایا ہے لکھتے ہیں

"دعا مانگنے کی ضرورت کب آتی ہے؟ آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ مظلوموں اور بے کسوں کو خدا سے دعا مانگنے کی ضرورت کہاں اور کب پیش آتی ہے؟ اسکی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس غلط معاشرہ میں جہاں کوئی بات قاعدے اور قانون کے مطابق نہ ہوتی ہو ہر جگہ دھاندلی ہو رہی ہو کسی حقدار کو اس کا حق نہ ملے..... یہ ہے وہ معاشرہ جہاں بے کسوں اور ناداروں کو قدم قدم پر خدا سے دعائیں کرنی پڑتی ہیں کہ اس کے سوا ان کے سامنے امید کا کوئی سہارا نہیں ہوتا۔" ص ۳۷۶

اس باب کا مطالعہ کرنے سے پرویز صاحب کے جو افکار و خیالات سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

کہ جہاں کہیں معاشرے کے کسی فرد کو کوئی مسئلہ درپیش ہو۔ اس کو حل کرنے کی ساری ذمہ داری حکومت وریاست پر ہوگی۔ سو اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ دنیا میں اس وقت اگر کہیں فلاحی ریاست موجود ہے تو اس ریاست کے چھوٹے موٹے مسائل تو یقیناً ریاست و حکومت حل کرے گی۔ مگر بعض ایسے مسائل بھی تو ہوتے ہیں۔ جو حکومت کے دائرہ کار میں نہیں آتے یا آتے بھی ہیں تو ان کا اس کے پاس حل موجود نہیں ہوتا مثلاً فلاحی ریاست کا کوئی باشندہ ایڈز جیسے مہلک اور لاعلاج مرض میں مبتلا ہے۔ تو وہاں اگر اس کے ہاتھ میں دعا کا سہارا بھی نہ رہے یا ذات خداوندی کا وہ تصور جو عام مسلمانوں کا ہے وہ بھی نہ رہے تو اس تصور خدا میں جو پرویز صاحب دے رہے ہیں میں ماسوائے مایوسی اور قنوطیت کے اور کیا ہے؟ یہ درست ہے کہ ہماری اکثر حکومتیں اور ارباب حل وعقد اپنی ذمہ داریوں اور شہریوں کے بنیادی حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی اور ذمہ داریوں کو نبھانے سے پہلو تہی کرتے ہیں مگر ایسے لاتعداد مسائل تو ان فلاحی ریاستوں میں بھی ہو سکتے ہیں جن کا تصور پرویز صاحب پیش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں خلافت راشدہ خصوصاً حضرت عمرؓ کی خلافت کی مثال دی جاسکتی ہے۔ جو کہ پرویز صاحب کے بھی آئیڈیل ہیں کیا حضرت عمرؓ اور دیگر خلفاء دعاؤں سے بے نیاز تھے؟ ہرگز نہیں۔ خلفاء راشدین خصوصاً حضرت عمرؓ شب وروز کی محنت شاقہ اور قوانین فطرت کو Follow کرتے ہوئے بھی صبح وشام اپنے اللہ سے مانگتے رہے۔ اس بات کی گواہی خود پرویز صاحب کی کتاب "شاہکار رسالت" ہی دے گی۔

اگر دعا ہی بے سود ہے تو پھر جنگ بدر کے آغاز میں حضورؐ اتنے خشوع وخضوع کے ساتھ دعا میں کیوں مصروف رہے؟ خود پرویز صاحب ہر نماز کے اوائل میں اھدنا الصراط المستقیم اور اواخر میں ربنا اتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة کیوں پڑھتے ہیں۔ (سلیم کے نام ایک خط میں انہوں نے اس بات کا برملا اعتراف واظہار کیا ہے کہ میں احناف کے طریقے پر نماز پڑھتا ہوں)

اس بات سے ہرگز انکار ممکن نہیں کہ ہمارے دین نے ہمیں مختلف شعبہ ہائے حیات میں کامیابی و کامرانی حاصل کرنے کے لئے محنت اور سعی کی تعلیم دی ہے ہم محنت اور سعی کریں گے تو کامیاب وکامران رہیں گے ساتھ اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر التجا و دعا ہوگی تو کامیابی کی امید یقین میں بدل جائے گی۔ یہی تو خدا کی شان ہے جو بندوں کی دعاؤں کو قبول کرتا اور ان کے اعمال کو نتیجہ خیز بناتا ہے یہاں ایک بات بطور خاص ذکر کرنا چاہوں گا کہ بعض اوقات Natural Laws کو بھی Follow کیا گیا ہو۔ خوب محنت اور کوشش بھی کی گئی ہو اور پھر بھی نتیجہ آسمانی آفات کی نذر ہو جاتا ہے جس وقت یہ آرٹیکل میں لکھ رہا ہوں اور جو اخبارات میرے سامنے ہیں ان سے یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تھر، بلوچستان اور دیگر بعض علاقوں میں خشک سالی اور قحط نے انسانی

وسائل اور مساعی کو کس قدر بے بس کر دیا ہے۔ لہٰذا حیثیت مسلمان ہمارا عقیدہ یہ ہوگا کہ قوانین فطرت کو مد نظر رکھتے ہوئے مادی وسائل ضرور اپنائیں اور پھر اللہ پر بھروسہ کر کے اس کے مثبت نتائج کی خاطر دست بدعا بھی رہیں گے۔ کیا تھر، بلوچستان اور خشک سالی سے متاثرہ علاقوں میں دیگر بہت سارے وسائل کو ملحوظ خاطر اور روبہ عمل لاتے ہوئے ہم ذات خداوندی سے التجا کو نظر انداز کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔

صلوۃ الکسوف (سورج گرہن) صلوۃ الخسوف (چاند گرہن) صلوۃ الجنازہ، صلوۃ الاستسقاء (بارانِ رحمت کے لئے دعاء اھدنا الصراط المستقیم سے آغاز نماز اور ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة سے اختتام نماز وغیرہ دعا ہی تو ہے جن پر مسلمانان عالم کا اپنی دینی تعلیمات کی روشنی میں عملاً و عقیدۃً اتفاق ہے یہ تو قرآن ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ جب طالوت اور جالوت کے مابین مقابلہ حق و باطل ہو رہا تھا تو میدان جنگ میں طالوت اور اسکے مسلمان ساتھیوں نے یہ دعا کی تھی ربنا افرغ علینا صبرا وثبت اقدامنا وانصرنا علی القوم الکافرین اور اللہ نے اس عمل کو پسندیدہ قرار دیا اور انہیں کامیابی عطا کی۔ اگر صرف مادی وسائل اور قوانین کو بروئے کار لانے میں ہی کامیابی کا راز مضمر ہے تو وہ سارے وسائل تو طالوت اور جالوت دونوں بروئے کار لا چکے تھے اس کا واضح مطلب یہی ہے کہ ایک خدا ایک قادر المطلق ایک مجیب الدعا ضرور ہے جو ہماری دعاؤں کو سنتا ہے۔

سارے قرآن کا نہیں تو کم از کم ابتدائی دو سورتوں یعنی البقرہ اور سورۃ آل عمران کا مطالعہ بھی کیا جائے تو ان دو سورتوں میں کئی ایک دعاؤں کا تذکرہ بالکل غیر مبہم انداز میں موجود ہے۔ ملاحظہ کیجئے۔ سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۸۶، سورہ آل عمران آیت نمبر ۸، آیت نمبر ۱۶، آیت نمبر ۲۶، آیت نمبر ۱۴ اور آیت نمبر ۱۹۳۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ بعض دانشور قرآن و سنت کی تعبیر و تشریح کرتے ہوئے افراط و تفریط کا شکار ہو جاتے ہیں ان میں سے بعض مادی وسائل اور قوانین فطرت کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے صرف توکل علی اللہ کا خشک اور غلط مطلب اخذ کرتے ہیں جبکہ بعض نے صرف مادی وسائل یا مادہ (Materialo) کو ہی خدا سمجھ لیا ہے یہ دونوں گروپ انتہا پسند ہی کہلائیں گے۔

ہمارے دین نے ہمیں عقائد، عبادات اخلاقیات اور معاملات بلکہ ہر شعبہ زندگی میں اعتدال سے کام لینے کی تعلیم دی ہے۔ موضوع زیر بحث کے حوالے سے یہ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات قادر المطلق پر بھی ایمان رہے۔ اور حتی المقدور مادی وسائل کو بھی اپنایا جائے۔ دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھیں گے تو ہم مسلمان کہلائیں گے۔ یہی ہمارے دین کا مقصود و مطلوب ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ہمیں افراط و تفریط سے اجتناب کرنے کی توفیق عطا فرمائے آمین۔ وما علینا الا البلاغ۔